التربیۃ فی الاسلام

تحریر:۔ الشیخ محمد رضا الشبیبی ☆ ترجمہ:۔ سید محمد کبیر احمد مظہر، ایم اے

قومی تعلیم و تربیت کے بارے میں عالم اسلام کی مساعی عرصہ دراز سے اب تک مختلف قسم کے نظاموں کے ذریعہ جاری رہی ہیں۔ ان میں سے بعض نظام قدیم اور جامد ہیں، جو اس دور کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں اور ترقی پسندانہ مقاصد کو پورا نہیں کرتے۔ بعض نظام جدید ہیں جن میں ہم نے حرف بحرف مغرب کی تقلید کی ہے اور بعض نظام ان دونوں کے بین بین ہیں۔ کئی اسلامی ممالک نے بدیسی نظاموں کو اس طرح من وعن قبول کر لیا ہے کہ اب ان کی قومی تربیت اور کردار سازی میں، اپنے ماضی سے ان کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ مغربی یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والے ہمارے نوجوان جب مشرقی ممالک میں واپس آتے ہیں تو ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملک کی نسبت بیرونی ممالک کے متعلق زیادہ وسیع معلومات رکھتے ہیں۔ انھیں اپنی ملی تاریخ کی نسبت دیگر اقوام کی تاریخ پر زیادہ عبور ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے ہم وطن افسروں کے ماتحت کام کرنے کی نسبت بیرونی سرپرستی میں ملازمت کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

اس میدان میں مسلمانوں کی مساعی کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں مغرب کے بعض مفکرین نے فاش غلطیاں کی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ قوم نقالوں کی ایک جماعت ہے۔ لہٰذا اس کے ہاں ندرت فکر و عمل کی تلاش بے سود ہے۔ انھیں یہ وہم لاحق ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کا قدیم نظام تعلیم نئے برگ و بار پیدا کرنے کے قابل نہیں رہا۔ چونکہ اس کا دار و مدار تمام تر حفظ اور اعادہ پر ہے۔ اس لئے یہ نظام جدید فکر و نظر کے مطابق ہمیں کوئی نئی چیز نہیں دے سکتا۔

اس مضمون میں ہمارا مقصد ان باطل خیالات کی لغویت کو ظاہر کرنا ہے اور ان عظیم مساعی کا دفاع کرنا ہے جو ہمارے پیش رو تربیت کاروں نے نوجوانوں میں اعلیٰ اخلاقی اصول کی آبیاری اور بلند افکار کی پرورش کے لئے کیں۔ اس وجہ سے اس بحث کا ایک متوازن تاریخی جائزے کی صورت اختیار کر لینا

زیادہ قرین قیاس ہے۔ لیکن یہ جائزہ قدیم مشرق و مغرب کے ہر دو حصوں میں تعلیم و تربیت کے مختلف نظاموں اور طریقوں کے باہمی موازنہ سے خالی نہ ہوگا۔ کیونکہ اس وقت کے عالم اسلام میں تعلیم و تربیت کے اسالیب یکساں نہ تھے۔ بلکہ ان میں کثیر اختلافات موجود تھے۔ جن کی وجہ سے مشرقی اور مغربی اسالیب میں امتیاز کرنا چنداں مشکل نہ تھا۔ مگر یہ اختلافات بھی اکثر اوقات اساسی نہ تھے۔ اس لئے تربیت کے ان نظاموں میں اگر ایک طرف عملیت و واقعیت کے پہلو نمایاں تھے تو دوسری طرف نظریت و مثالیت کو بھی پیش نظر رکھا گیا تھا۔ اور اگر ایک طرف ابتدائی درجات میں روزمرہ زندگی کی ضروری تعلیم کا لحاظ رکھا گیا تھا تو دوسری طرف انتہائی جماعتوں میں وسیع اور دقیق علمی مباحث کو بھی اہمیت دی گئی تھی۔

اسلام کی عظمت کا تاج محل ——— جس تعلیم کی بنیادوں پر استوار ہوا، وہ اسلامی تعلیم تھی۔ اور مسلمان ماہرین تعلیم کے فیض سے اس کے اثرات پوری امت کے دلوں میں راسخ ہو گئے تھے۔ وہ صدق مقال، اخلاص عمل اور استقامت کے بارے میں لوگوں کا محاسبہ و مواخذہ کیا کرتے تھے۔ اور انہیں مردانگی، ضبط نفس اور عوامی بہبود کے لئے باہمی تعاون اور اتفاق کی طرف دعوت دیتے تھے۔ انہوں نے حریت و مساوات کی قدر و منزلت کو دوبالا کر دیا اور اس شعور کی ترویج میں کوشاں رہے کہ نور معرفت سے بہرہ ور ہونا سب سے بڑی خوش نصیبی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ امت مسلمہ کی عظمت کا دبدبہ تمام عالم پر چھا گیا۔ عوام کو قانون سے قلبی رابطہ ہو گیا اور وہ ہر وقت اس کی اطاعت و پیروی پر آمادہ رہنے لگے۔ وہ عند الطلب آزادانہ اظہار رائے کرتے اور بوقت ضرورت جود و سخا میں کمی نہ کرتے۔

دور حاضر کی طرح زمانۂ قدیم میں بھی عالم اسلام میں تعلیمی درجات تین ہی تھے:-

(۱)۔ ابتدائی تعلیم۔ (۲)۔ ثانوی تعلیم۔ (۳)۔ جامعہ یا یونیورسٹی کی انتہائی تعلیم۔

ان درجات کے لئے خاص نظام اور تعلیمی طریقے وضع کرنے اور مضامین کے مناسب نصابی کتابوں کے انتخاب میں متعدد علماء نے ترتیب پر خاص توجہ دی۔ اور اس موضوع پر علمی کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے بعض اہل مشرق ہیں جو عراق، شام، خراسان اور ماوراء النہر میں پیدا ہوئے۔ اور بعض اہل مغرب[1]

---

[1] یہاں اہل مشرق اور اہل مغرب کی تقسیم موجودہ عام تقسیم سے مختلف ہے۔ اس میں بلاد اسلامیہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن کے لئے مصنف نے مشارقہ اور مغاربہ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ (ادارہ)

مصر، اندلس، افریقہ اور مغرب اقصیٰ میں فن تعلیم و تربیت کے ماہرین کے نام سے مشہور و معروف ہوئے۔ قیروان اپنے سنہرے دور میں قرطبہ سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اور دیارِ مغرب کے طلبہ اکثر تعلیمی غرض سے اسی شہر کو اپنی منزلِ مقصود بناتے تھے۔ تعلیمی میدان میں ان کے اثرات ایک دوسرے سے مختلف تھے، اور ہر دو کا مزاج و منہاج اپنا اپنا تھا۔

المدرسۃ المغربیۃ :۔ اس دور میں مسلمان ماہرین تعلیم و تربیت کے بعض تحقیقی رسالے مشرق و مغرب میں قبولِ عام حاصل کر گئے تو انہیں اسباق کی شکل میں مدون کیا گیا اور ان پر حواشی تحریر کئے گئے۔ چنانچہ ہمارے بعض محققین کی تحقیق کی رو سے بچوں اور نو آموز طلبہ کی ابتدائی اور اساسی تعلیم کے متخصص (SPECIALIST) تربیت کار بلا شبہ اولاً اندلس، قیروان اور افریقہ کے مغربی مدرسہ سے نسبت رکھنے والے ہیں۔ اور اس کے بعد ثانیاً مصری مدرسہ سے تعلق رکھنے والے۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مغربی مدرسہ تعلیم بچوں پر انتہائی توجہ دینے میں ممتاز ہے۔ لیکن اس مدرسے پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے ۔۔ یعنی اس کا سب سے بڑا عیب یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کی تمام تر توجہ حفظ اور تکرار پر مرکوز تھی۔ اور بحث و تمحیص اور استقرا پر بہت کم دھیان دیا جاتا تھا۔ نتیجۃً تربیت کا یہ طریقہ لبا اوقات بے ثمر اور بے اثر ثابت ہوا۔ بحث و تحقیق کے طریقہ پر تربیت کرنے والوں نے مغربی مدرسہ کی اس کمزوری کو بہت محسوس کیا۔ اور اس پر سختی سے گرفت بھی کی۔ انہوں نے اس طریقہ تعلیم پر اہلِ شرق کے طرزِ تعلیم کو فضیلت دی ہے۔ جس کی خصوصیات مسائل کے افہام و تفہیم پر زور دینا۔ دقتِ نگاہ۔ انشراحِ صدر اور وسعتِ ذہنی ہیں۔

بعض ماہرینِ نفسیات کی رائے میں کثرتِ حفظ کے فوائد بھی ہیں۔ کیونکہ عرصہ گذر جانے کے بعد بھی حفظ شدہ اشیاء کے نقوش حواس باطنی پر مرتسم ہو کر باقی رہ جاتے ہیں۔ یہ نقوش ملکہ سازی میں ایک اہم عامل کا کردار ادا کرتے ہیں، خصوصاً فنونِ ادبیہ کے لئے ملکہ سازی میں بلکہ مجملاً تعمیرِ ثقافت میں بھی۔ اس بارے میں ابن خلدون کے نظریات نہایت بیش قیمت ہیں، کیوں کہ ادب و بلاغت کا ملکہ پیدا کرنے اور نظم و نثر پر عبور حاصل کرنے میں اس کا ایک خاص مذہب ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ملکہ سازی کے لئے قوانینِ عربیہ مثلاً صرف، نحو، بلاغت اور بیان وغیرہ کافی نہیں۔ بلکہ اس کے حصول کے لئے نظم و نثر سے چیدہ چیدہ کلام بکثرت حفظ کرنا اور اس کے اسالیب کی مشق و ممارست لابدی

ہے۔ یہ طریقہ اس طالب علم کے لئے دشوار گزار ہے جس نے اصول و قواعد زبان پر ضرورت سے زیادہ توجہ دی ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے نحوی، عربی زبان کے ماہر اور قواعد و قوانین میں غرق رہنے والے بسا اوقات کسی مضمون کی ادائیگی کے لئے دو سطریں بھی صحیح نہیں لکھ سکتے۔ اور ضرور غلطی کرتے ہیں۔ یہ قول ابن خلدون کا ہے لیکن اس کی تائید تجربہ سے ہوتی ہے۔

دونوں مناہج کے مابین موازنہ:- اہل مغرب نے نوعمر بچوں کی تعلیم و تربیت پر زیادہ توجہ دی۔ اور ابتدائی مراحل تعلیم کے لئے نظام وضع کرنے اور مضامین کے مطابق انتخاب کتب میں اپنی تمام تر مساعی کو صرف کر دیا۔ اس امر پہ اگرچہ اہل مشرق نے بھی توجہ دی لیکن ان کی یہ توجہ ان کی اس توجہ کی نسبت بہت کم تھی جو انہوں نے یونیورسٹی کے اعلیٰ تعلیمی مراحل کی جانب مبذول کی۔ چنانچہ جامعی تعلیم کی طرف ان کا یہ انہماک بلاشبہ اس سارے دور میں بے مثال اور بے نظیر تھا۔

تیسری صدی ہجری کے مغرب میں ایک نام محمد بن سحنون کا ہے جس نے اپنی مشہور کتاب "آداب المتعلمین" لکھی۔ اور اس کے بعد آنے والے مؤلف نے اس پر حاشیہ چڑھایا۔ اس لئے بچوں کی تعلیم کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں اس کتاب کو اولیت حاصل ہے۔ چوتھی صدی ہجری میں القابسی القیروانی نے بھی اسے پڑھا اور اس کی مدد سے اپنی کتاب "الرسالۃ المفصلۃ لاحوال المعلمین والمتعلمین" تالیف کی۔ اس کتاب میں انہوں نے ابن سحنون کی کتاب سے کثیر عبارات اور حوالے نقل کئے ہیں۔ علاوہ ازیں تشریح و تفصیل کی رو سے بھی اسے ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ چنانچہ ہمارے بعض محققین کی یہ رائے ہے کہ اس پوری صدی میں لکھی جانے والی کتابوں کی نسبت سب سے زیادہ تفصیلات اسی کتاب میں پائی جاتی ہیں۔ اور اسی لئے اس دور میں تعلیم کودکاں کے مختلف رائج الوقت مناہج کو سمجھنے کے لئے یہ کتاب بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب اسلامی تربیت کے موضوع پر دیگر سب کتابوں سے زیادہ مکمل ہے۔ یہ کتاب علوم قرآنیہ اور ان کی تدریس کے بارے میں بصورت سوال و جواب لکھی گئی ہے۔ اور اس میں علوم قرآن کی تدریس کے لئے اہم انسانی علوم کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے مختلف مناہج و آراء کا بیان ہے۔ مثلاً اندلس کے تربیت کار تعلیم قرآن میں شعر و ادب اور کتابت و حساب وغیرہ کے عمل دخل کو باعث حرج نہیں سمجھتے تھے۔ حالانکہ افریقہ و قیروان کے بعض محدثین خصوصاً متقدمین صرف قرآن حکیم پر انحصار کرتے تھے۔ اور اس کی تعلیم ختم کر لینے کے بعد شعر و ادب اور کتابت کی تعلیم کا آغاز

کرتے تھے۔ ابن خلدون نے اس موضوع پر اچھی داد تحقیق دی ہے اور دونوں نقطہ ہائے نظر کا تفصیل سے موازنہ کیا ہے۔ اور آخر میں ابتدائی مراحل میں قرآن حکیم کی تعلیم پر اکتفاء کرنے والوں کے قول کو ترجیح دی ہے۔ چوتھی صدی ہجری میں القابسی القیروانی کے زمانے میں ہی محدث ابن عبدالبر القرطبی نے جامع اشتات العلم وفضلہ" تالیف کی اور اس میں اسلاف محدثین کے طریقے کی پیروی کی۔ حالانکہ یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ تربیت میں طریقہ محدثین کے التزام سے ایک قسم کا جمود پیدا ہو جاتا ہے۔

اس طبقہ کے بعد برھان الدین زرنوجی[1] آئے۔ وہ ماوراء النہر کے رہنے والے ترک تھے اور اہل مشرق کے نزدیک تعلیم اطفال میں اپنے طریقے کے امام ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر اپنی کتاب "تعلیم المتعلم وطریق التعلیم" لکھی ہے۔ جس سے ترکیہ کے علاقہ جات ماوراء النہر اور باقی بلاد اسلامیہ کے اساتذہ اور ماہرین تعلیم نے بہت استفادہ کیا۔ زرنوجی نے اس میں متعلمین کے لئے نہایت بیش قیمت ہدایات درج کی ہیں۔ مثلاً:۔

" طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ ہر وقت استفادہ کے درپے رہے۔ اس مقصد کے لئے اُسے ہر وقت اپنے پاس قلم دوات وغیرہ رکھنی چاہیئے تاکہ جہاں کوئی علمی بات سنے فوراً قلم بند کرلے۔ چنانچہ داناؤں کا قول ہے:۔ جو چیز یاد کی گئی بھاگ گئی اور جو بات تحریر کرلی گئی ٹھہر گئی ــــ"

شیخ زرنوجی کے حالاتِ زندگی کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں ہے۔ اور نہ ہی ہمیں ان کی کوئی مکمل سوانح حیات ملی ہے۔ ہماری نگاہ میں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کی نفی کرنے میں انتہا تک پہنچ گئے تھے۔ اور عزلت وگمنامی کی طرف حد درجہ مائل تھے۔ ان کا رسالہ استناد نصوص اور طریق تطبیق کی رو سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اپنی رائے کو نظائر و

---

[1] زرنوج۔ یہ نام زرنوق یعنی قاف کے ساتھ زیادہ مشہور ہے۔ جو ترکستان کی عملداری میں ماوراء النھر کا ایک شہر ہے اور خجند کے ساتھ واقع ہے۔ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں اتنا ہی لکھا ہے۔ جب کہ السمعانی نے کتاب الانساب میں اس لفظ کا قطعاً ذکر نہیں کیا۔

شواہد سے مضبوط کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ ان کا حال اس ماہر تربیت جیسا ہے جو مشاہدہ و عمل کے دونوں وسائل سے مدد لینے کا متمنی ہو۔ چنانچہ جب وہ اپنے نظریہ کی تائید کے لئے کسی واقعہ یا حکایت کو مثالاً بیان کرتے ہیں تو ان کی یہ خواہش نمایاں ہو جاتی ہے کہ یہ مثالیں اور نمونے ایک طالب علم اور قاری کو اس رنگ میں متمثل کر دیں جس کے مطابق وہ تعلیم و تربیت کا تانا بانا بُننا چاہتے ہیں۔

غرضیکہ مذکورہ بالا تمام کتب و رسائل میں تعلیم و تربیت کے اسلامی و شرعی طریقوں اور نظاموں کو بیان کیا گیا ہے، اور ساتھ ساتھ مختلف قسم کے پند و نصائح اور اقوال و فوائد کا اضافہ کیا گیا ہے جنہیں اس دَور کے مؤلفین نے بلحاظ وقت ضروری سمجھا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجر جزیل عطا کرے۔ ان کے مقاصد نیک تھے اور انہوں نے عصری تقاضوں کے مطابق ہر متعلقہ مسئلے کو اپنے نظام تعلیم میں شامل کر کے عوام کی ضرورت کو پورا کر دیا۔

تعلیم و تربیت میں علم نفسیات کی اہمیت مسلّم ہے۔ اس بارے میں ہم بلاخوف تردید یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ نفس بشری کے اندرون کے متعلق اس طبقہ کی معلومات ہمہ جہتی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ معلومات وسیع نہ تھیں محدود تھیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ تعلیمی مراحل میں درجہ بندی کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ طلبہ پر نرمی و شفقت کی نصیحت کرتے ہیں اور ان پر سختی کرنے سے روکتے ہیں۔ ان کا طریقہ تربیت ترہیب کی بجائے ترغیب کے اصولوں پر مبنی ہے۔ اور ان کے ہاں طلبہ کی نگہداشت کے لئے اور ان کی فطری و خداداد صلاحیتوں کو جانچنے کے لئے عمدہ ہدایات موجود ہیں۔

اب دوسری طرف آئیے۔ ہم عالم اسلام کے بیدار مغز تربیت کاروں کو تین طبقات میں تقسیم کر سکتے ہیں:۔

۱۔ طبقہ فقہاء و محدثین :۔ اکثر مغربی مربیین اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا نظام تعلیم ابہام و تعقید سے پاک اور آسان فہم ہے۔ لیکن صرف نوعمر بچوں کی تعلیم و تربیت تک محدود ہے۔

۲۔ طبقہ نظّار و فلاسفہ :۔ اس طبقہ سے مشرق کے علمائے تربیت منسوب ہیں۔ ان کے بعض طریقے تعقید و اشکال سے خالی نہیں۔

۳۔ طبقہ صوفیاء:۔ ان کے طریقے کثیر ہیں۔ ان میں سے اکثر حضرات اپنے تلامذہ کو خلفائے راشدین کے دستور العمل کو اپنانے کی تاکید کرتے ہیں۔

المدرسۃ المشرقیۃ:۔ مغرب کے علمائے تربیت کے طبقات اور ان کے مذاہب تربیت کی بات ہو چکی۔ اب ہمارے ذمہ مشرق کے علمائے تربیت اور ان کے مذاہب تربیت پر ایک مستقل فصل قائم کرنا باقی رہ گیا ہے۔ مشارقہ سے ہم وہ فلاسفہ، اہل نظر اور علمائے تعلیم مراد لیتے ہیں، جن کا مولد و منشا مشرق ہے۔ جس کا نقطۂ آغاز عراق اور مضافات عراق ہے۔ ہم انشاءاللہ فصل ہذا یا فصل مابعد میں مشرق اور مغرب کے مذاہب تربیت کے مابین چند اہم اختلافات و امتیازات کی نشان دہی کریں گے۔ نیز بتائیں گے کہ مولد و منشا اور ماحول کے وہ کون سے اثرات ہیں جو ان اختلافات کے ظہور کا سبب بنے۔

عراق کے ماحول اور بلاد افریقہ و مغرب کے ماحول میں ایسے امتیازات موجود ہیں جنہیں معمولی نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً خالص اسلامی علوم دیگر بلاد اسلامیہ کی نسبت سب سے پہلے عراق میں مدوّن ہوئے۔ اور خارجی علوم مثلاً فلسفہ، منطق، ریاضی، ہیئت اور نجوم وغیرہ اولاً اسی علاقے میں درآمد کئے گئے۔ چنانچہ ان دونوں ثقافتوں کی اصول و تشریح کی کتابیں اولاً اسی جگہ معرض وجود میں آئیں۔ پھر عراق ہی سے نکل کر یہ علوم تمام دنیا میں منتقل ہوئے۔ اور مختلف علاقے ان کی نشر و اشاعت کا مرکز بن گئے۔ لہٰذا صرف تعلیم و تربیت ہی کا ایک مسئلہ نہیں بلکہ اگر زندگی کے جملہ شعبہ جات میں اہل عراق کا نقطۂ نظر دوسروں سے مختلف نظر آئے تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ذرا سے غور و فکر سے واضح ہو جائے گا کہ ان کا یہ باہمی اختلاف اسی قدر ہے جتنا کہ استاد اور شاگرد میں ہوتا ہے۔

دولت عباسیہ کے آغاز کار میں اہل عراق جن علمی و ادبی موضوعات پر تصنیف کے میدان میں دوسروں سے آگے نکل گئے، تعلیم و تربیت بھی انہیں میں سے ایک ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ابن مقفع کی کتب مثلاً "الادب الکبیر" "الادب الصغیر" (یہاں لفظ "ادب" بمعنی تربیت ہے) ۔۔۔ یا کتب جاحظ مثلاً "البیان والتبیین" کا جائزہ لا بدی ہے۔ جاحظ کو پڑھنے والا اس کی اکثر کتابوں میں اساتذہ کے اخبار و لطائف بکثرت دیکھے گا۔ نیز عہد مامون اور اس سے ماقبل و مابعد

فلسفہ تربیت کے بارے میں یونانی، سریانی اور فارسی زبانوں سے بہت ساری کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ پھر جب مذہبی فرقوں اور مکاتب فکر نے تشکیل پائی تو انہوں نے اس موضوع پر خصوصی توجہ دی۔ چنانچہ اخوان الصفا نے اپنے رسائل میں آداب تربیت پر جو کچھ لکھا ہے کم نہیں۔ اس کے بعد ابونصر فارابی کی کتاب "اھل المدینۃ الفاضلہ" قابل دید ہے۔ لیکن اس موضوع پر اس کی سب سے بہتر کتاب "احصاء العلوم" ہے۔ اس میں اس نے علوم کی ترتیب و تدوین سے بحث کی ہے۔ اور مختلف مقاصد کے لئے اس کے مختلف اسالیب و مذاہب کو بیان کیا ہے۔ فارابی سے متصل ابن مسکویہ کا زمانہ ہے۔ اس نے تعلیم و تعلم کے میدان اصلاح و تہذیب کے جملہ طرق و تدابیر کے موضوع پر اپنی کتاب "تہذیب الاخلاق و تطہیر الاعراق" تالیف کی، جس میں یونانی فلسفہ بھی بیان کیا لیکن ساتھ ہی یہ نصیحت بھی کردی کہ اسلامی زندگی کی ترقی میں کوشاں رہتے ہوئے آداب ملت اور احکام شریعت سے آراستہ ہونا چاہیئے اور فرائض کو باحسن وجوہ ادا کرنا چاہیئے، اس کے بعد ہی فلسفہ پر نظر ہو سکتی ہے۔ ابن مسکویہ نے فلسفہ کے طالب علموں کی رہنمائی کے لئے بھی شاندار کتب تالیف کی ہیں۔

ابن مسکویہ کے معاصر فلاسفہ کی تعداد کثیر ہے۔ ان میں مشہور ترین بلکہ تمام فلاسفہ اسلام میں سب سے زیادہ مشہور الرئیس شیخ ابوعلی ابن سینا ہے۔ اس کی مساعی جس طرح علوم و فنون کے لئے متواتر اور پیہم تھیں اسی طرح اس نے تعلیم و تربیت کی اصلاح و ترقی کی طرف بھی نمایاں توجہ دی۔ گذشتہ پانچ سال سے دنیا کی تمام یونیورسٹیاں اور مجالس فکر و ادب اس کی ہزار سالہ برسی منا رہی ہیں۔ اور اس مناسبت سے ان کی طرف سے ابوعلی ابن سینا کی شخصیت اور کام کے بارے میں کثیر لٹریچر بھی شائع ہوا ہے۔ ابن سینا ایسے ہی وسائل کے ذریعہ آج تک زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا کیونکہ وہ اپنی ذات سے ایک مستقل اور جاندار مکتب فکر بن چکا ہے۔

اگر ہم مشرق اور عراق کے فلاسفہ تربیت اور حکمائے تہذیب کی نام شماری کرنے لگیں تو بات بڑھ جائے گی۔ البتہ ایسے لوگ جنہوں نے اپنی زندگیاں اس کار عزیز میں صرف کر دیں اور انہیں فن تعلیم و تربیت کی ترتیب و تدوین اور اس پر تصنیف و تالیف سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا، ہمارے لئے ناقابل فراموش ہیں۔ ان کے سرخیل امام ابوحامد محمد بن محمد الغزالی ہیں۔ ان کی

کتابیں بچوں اور بالغوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق مختلف قسم کی ہدایات سے بھرپور ہیں۔ ان کی "احیاء العلوم" اور "ایہاالولد" اس موضوع پر عمدہ ترین کتابیں ہیں۔ اور "میزان العمل" میں بھی تربیت کے دائرہ کار پر بحث کی گئی ہے۔ یہی حال "فاتحۃ العلوم" کا ہے۔ الغزالی "التربیۃ" اور "التعلیم" کے الفاظ اپنی کتابوں میں کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔[۱] لیکن دیگر علماء نے بھی ان الفاظ کو کم استعمال نہیں کیا ہے۔ بلکہ ان کا ایک ایسے شخص کی زبان سے صادر ہونا جو بغداد کے مشہور مدرسہ نظامیہ کے معدودے چند اکابر اساتذہ میں سے تھا کچھ تعجب خیز بھی نہیں۔ پھر کثیر لوگوں نے فقہا و محدثین کے طریقہ پر الغزالی کی پیروی کی۔ مثلاً:-

۱۔ الماوردی[۲] نے اپنی کتاب ادب الدنیا والدین میں۔

۱۔ الغزالی فرماتے ہیں (میزان العمل ص ۶۸): تخلیقات الٰہیہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس میں ہمارے فعل کا اثر نہیں ہوتا۔ جیسے افلاک و کواکب۔ اور دوسری قسم وہ ہے جس میں فطری طور پر مابعد کمالات کے لئے قوتِ قبول رکھی گئی ہے۔ مگر تربیت کا لحاظ شرط ہے۔ جب کہ تربیت بھی اختیار سے متعلق ہو۔ مثلاً گٹھلی بذات خود نہ سیب ہوتی ہے نہ درخت۔ لیکن تربیت سے درخت بن جانے کی قابلیت اس میں بالقوۃ موجود ہوتی ہے۔ اور سیب بننے کے لئے قوتِ قبول نہیں ہوتی۔ پھر گٹھلی سے درخت بننے کے لئے اس کی پرورش اور تربیت میں آدمی کا اختیار متعلق ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح اگر ہم چاہیں کہ غضب و شہوت کو بالکلیہ ختم کر دیں تو ہم ناکام رہیں گے۔ لیکن اگر ہم ریاضت و مجاہدہ سے ان کو مغلوب اور تابع کرنا چاہیں تو ہم اس پر قادر ہو جائیں گے۔

۲۔ الماوردی نے اپنی کتاب میں تعلیم و تہذیب پر کئی فصلیں قائم کی ہیں۔ ایک فصل ان آداب پر مشتمل ہے جن سے متصف ہونا متعلم اور معلم دونوں کے لئے ضروری ہے۔ دوسری فصل کا عنوان یہ ہے: "علماء کے لئے اہم ابتدائی آداب"۔ اس فصل میں الماوردی نے متاخرین علمائے تربیت کے منہاج پر خیالات ظاہر کئے ہیں۔ مثلاً اس نے لکھا ہے: "اساتذہ کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ کسی متعلم پر سختی نہ کریں۔ کسی نوخیز کو سزا نہ دیں، اور کسی مبتدی کو ذلیل نہ کریں، تو اس کا دل تعلیم کے لئے آمادہ ہوگا۔ جذبات تیز ہوں گے۔ اور رغبت بڑھے گی۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

(باقی اگلے صفحہ پر)

۲ - الطبرسی نے اپنی کتاب مکارم الاخلاق میں۔

۳ - نصیر الدین طوسی نے اپنی جملہ کتب میں خصوصاً جس کا نام پہلے "آداب البحث" تھا اور بعد میں "اخلاق ناصری" ہوا۔ اس کی اصل فارسی میں ہے اور اس میں بشری عادات و خصائل کی تعدیل و حالت کے بارے میں مبسوط کلام کیا گیا ہے۔

۴ - الشہرزوری نے رسائل الشجرۃ الالٰہیۃ میں۔

۵ - زین الدین العاملی المعروف بالشہید الثانی نے اپنی کتاب منیۃ المرید فی آداب المفید و المستفید میں۔

اور ان کے علاوہ دوسری بہت سی کتابوں میں جنہیں تعلیم و تربیت اور آداب بحث و تحقیق میں ماخذ و مراجع کی حیثیت حاصل ہے، الغزالی کی پیروی کی گئی ہے۔

اور جیسا کہ معلوم ہے سب سے پہلے مشرق میں علمی دور کا آغاز ہوا۔ اور مدارس کے لئے انواع و اقسام کی عالی شان عمارتیں اس طرح تیار ہوئیں کہ موجودہ دور کے مروجہ عمدہ ڈیزائن اکثر صورتوں میں

(بقیہ حاشیہ) ارشاد فرمایا ہے "تعلیم کے وقت سختی نہ کرو۔ سخت گیر کہلانے کی بجائے استاد کہلانا زیادہ بہتر ہے۔ ایک فصل میں الماوردی نے طالب علم کو معلم سے فضول بحث کرنے سے روکا ہے، خواہ طالب علم کے معلم سے کتنے ہی دیرینہ تعلقات ہوں۔ پھر الماوردی نے ان اعلیٰ آداب و اخلاق کا ذکر کیا ہے جن سے متصف ہونا اساتذہ کے لئے لابدی ہے۔ مثلاً ذہانت و فطانت اور روح تربیت سے عمیق تعلق رکھنے والی دیگر خوبیاں، اس کے نزدیک معلم کو ایسی فراست کا مالک ہونا چاہیئے جس سے وہ متعلم کی حدِ استعداد اور پایۂ استحقاق کو جانچ سکے۔ تاکہ وہ اسے اتنا ہی دے جتنے کے لئے اس کی ذکاوت متحمل ہو سکے یا جس سے ہمارے غبی اور کند ذہن طلبا کی کمزوری میں کم از کم اضافہ نہ ہو۔ اس طریقے کو اختیار کرنے سے علماء کو مسرت حاصل ہو گی اور طلباء کو کامرانی۔ الماوردی کے ان خیالات کے ساتھ ابن خلدون کے عمدہ افکار بھی قابلِ توجہ ہیں۔ اس نے تربیت کار کو طبیب سے مشابہت دی ہے۔ طبیب حاذق مریضوں کا علاج ایک ہی طریقہ سے نہیں کرتا۔ بلکہ مرض، عمر اور مزاج وغیرہ کا اختلاف ہمیشہ پیشِ نظر رکھتا ہے۔

ان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں معلوم ہوتے۔ خصوصاً وہ عظیم الشان مدارس جنہیں سلاجقہ کے مدبر ناظم نظام الملک نے پانچویں صدی ہجری میں اولاً نیشاپور میں اور ثانیاً بغداد میں قائم کیا، جو اسی کے نام سے منسوب و موسوم ہو گئے۔ اور جنہیں المدرستہ النظامیہ کہا جانے لگا۔ ان میں جملہ سہولتوں اور آسائشوں کا خیال رکھا گیا تھا۔ مثلاً اقامت گاہیں تھیں، وظائف تھے، لائبریریاں تھیں اور شاندار علمی روایات تھیں۔ وہاں سے جو متقر علماء پڑھ کر نکلے ان کا شمار تمام اسلامی تاریخ کے معدودے چند علماء میں ہوتا ہے۔ پھر جب ان مدارس پر زوال آیا تو ساتویں صدی ہجری کے وسط میں مدرسۃ مستنصریہ جاری ہو گیا جس کے کھنڈرات اپنی عظمت کی اور اپنے دَور اوّل کی علمی تحریک کی جلالت شان و جمدگی کی ابدالآباد تک گواہی دیتے رہیں گے۔

ہمیں بچوں کی تعلیم و تربیت کے آداب اور معلمین و مودبین کے احوال کے متعلق نوادر و فوائد تاریخ اور ادب کی اکثر کتابوں میں آسانی سے مل جاتے ہیں۔ مثلاً الجاحظ کی کتاب "البیان والتبیین"۔ ابن مقفع کے رسائل اور ابوحیان التوحیدی وغیرہم کی کتابیں۔ لیکن اس معاملہ میں فقہاء و محدثین اور ادباء و مصنفین کے درمیان یہ فرق ہے کہ پہلے طبقہ نے تربیت کی مشق علم و عمل کے دونوں پہلوؤں پر کی۔ اس میں خوب مہارت بہم پہنچائی۔ اسے بطور پیشہ اختیار کیا اور پھر اس پیشے میں عظیم کامیابیاں حاصل کیں۔ اس طرح انہیں علم نفسیات میں وہ تجربہ حاصل ہوا جو آج کل کے ماہرین نفسیات کے روایتی علم سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ دوسرے طبقہ یعنی ادیبوں اور انشاء پردازوں نے معلمین و مودبین کے لطائف و اخبار تحریر کئے اور ان میں ان کے اسالیب تربیت کی نشان دہی کی۔ مگر وہ محدثین و مفسرین اور فقہاء کی مانند خالص فن تربیت یا اصول تعلیم پر کوئی مستقل اور مکمل تصنیف نہ لکھ سکے۔

دول فاطمیہ، اتابکیہ و ایوبیہ اور دولت ممالیک کی عظیم مساعی جو انہوں نے موصل، شام، فلسطین اور قاہرہ وغیرہ میں مدارس قائم کرنے کے لئے کیں، شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔ اور جو مساعی بلاد مغرب میں روبہ عمل لائی گئیں بلاشبہ وہ بھی عظیم تھیں، لیکن اس کے باوجود پیشروی و تجدید کی فضیلت کا سہرا مشرق اور مشارقہ ہی کے سر رہا، اور باقی حکومتوں اور ممالک نے ان کی ہمنوائی کی۔

اسی طرح ممالک، ان کے حالات، اور زمان و مکان کے اختلاف اور تفاوت کی بنا پر علمی تحریک کا

مزاج متاثر ہوتا رہا۔ اور تعلیمی روایات اور معیارات بدلتے رہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مشرق میں یہ معیار اکثر اوقات بلند رہا ہے۔ جب کہ اندلس اور مغرب میں اکثر اوقات علمی تحریک ساکن رہی۔ لیکن قرطبہ قیروان اور قاہرہ کا مختصر دور اس سے مستثنیٰ ہے۔ جس میں بلاد اندلس کے فلاسفہ ابن باجہ، ابن طفیل، ابن رشد اور ابن زہر وغیرہ سامنے آئے۔ اور انہوں نے بالآخر مشرقی حکماء و فلاسفہ کے مقابلہ میں دقیق تحقیقات اور وسیع کارکردگی کی بنا پر ایک امتیازی مقام حاصل کر لیا۔ کیونکہ انہوں نے کبھی بھی محاکمہ و ترجیح کو نظر انداز کر کے صرف نقل و جمع پر اکتفا نہ کیا۔ بلاشبہ یہ علمی تحریک تحقیقی تالیفات کی تحریک تھی جو منگولوں کے ہاتھوں مشرق کی تباہی کے بعد مصر میں منتقل ہو گئی تھی۔

دونوں مدارس کے باہمی فرق کے بارے میں ابن خلدون کی رائے:۔

ابن خلدون نے بعض مستقل فصلوں میں اپنے زمانے کے مروجہ اصول تعلیم و تربیت پیش کر کے ان پر تنقید کی ہے۔ پھر آخر میں مشرق و مغرب کے باہمی فرق کو بیان کرنے کے لئے دونوں مقامات کے مروجہ متنوع نظاموں اور طریقوں میں باہم دگر موازنہ کیا ہے۔ اس نے بچشم خود دیکھا کہ مغاربہ کے ہاں متضاد روایات کی تطبیق کے لئے بحث مباحثہ پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے، اور نقل اور حفظ کے سلسلہ کے باعث ان کے ہاں جمود کا مرض پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے خیال میں نقل و حفظ پر ان کی قناعت کا باعث ان کا سارے عالم سے کٹ کر دور ایک گوشۂ عزلت میں سکونت پذیر ہونا تھا۔ وہ مغرب کے مناہج و اوضاع تعلیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور تحصیل و روایت کی خاطر مشرق کی طرف مغاربہ کے سفروں کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتا ہے:

"واضح ہو کہ مغرب میں زوال حکومت اور عمرانی تباہی کے باعث باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ تقریباً ختم ہو گیا۔ اور اس وجہ سے کہ قیروان و قرطبہ مغرب اور اندلس کے صدر مقام تھے، ان کی آبادی دن بدن بڑھنے لگی اور وہاں علوم و فنون کے بازار گرم ہو گئے۔ لیکن جب یہ دونوں شہر بھی تباہ ہو گئے تو مغرب میں تعلیم کا سلسلہ رک گیا۔ صرف مراکش میں موحدین کے عہد تک خفیف سا اثر موجود رہا۔ قرطبہ و قیروان میں سلسلہ تعلیم کے انقطاع سے مغرب کے تمام علاقے اچھی تعلیم سے خالی ہو گئے۔ اور وہاں میں باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ باقی نہ رہا۔ اس سے ان کے لئے ملکہ پیدا کرنا دشوار ہو گیا۔"

ابن خلدون نے لکھا ہے کہ چونکہ مشارقہ کے طریقہ تعلیم کے برعکس مغاربہ کا طریقہ اسباق و مضامین

کو حفظ کر لینے پر موقوف ہے اس لئے یہ طریقہ عقیم ہے۔ وہ اس پر بحث کرتے ہوئے طلبہ مغاربہ کے بارے میں کہتا ہے:۔

"ان کے لیے حصول ملکہ اور حذاقت علمی سخت دشوار ہو گئے۔ کیونکہ حصول ملکہ کے راستے علمی مسائل مسائل پر باہمی گفتگو اور بحث و نظر میں سرگرم حصہ لینے سے ہی آسان ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص حصول علم کی نیت سے ان کے مراکز علمی میں چلا جائے تو اسے معلوم ہوگا کہ وہاں کے طلبہ مجالس علمیہ میں ساری ساری عمر کھپانے کے باوجود کورے کے کورے رہتے ہیں۔ وہ حفظ پر ضرورت سے زیادہ توجہ دینے کے باعث اظہار اور افاضہ علمی سے دور رہتے ہیں۔ اور مدت مدید تک تحصیل و تعلیم کے باوجود ان میں حاصل کردہ علم کو استعمال کرنے کا ملکہ نہیں پیدا ہوتا۔ چنانچہ اگر آپ کو وہاں کے کسی فارغ التحصیل عالم سے ملنے کا موقع ملے تو آپ جان لیں گے کہ وہ افاضہ و مناظرہ اور تدریس سے قاصر ہے۔ اس خامی کے اسباب مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ غلط اصول تعلیم اور اتصال سند کا منقطع ہونا۔

۲۔ حفظ پر حد سے زیادہ ارتکاز توجہ۔

۳۔ ان کا یہ خیال کہ علمی ملکہ سے مقصود صرف حفظ ہی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے"

ابن خلدون کے اس قول سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان ادوار میں مغاربہ کی تعلیم کا مدار محض حفظ پر تھا۔ اس لئے وہ بے ثمر اور روح سے خالی تھی۔ جبکہ دوسروں کے طریقے بارآور اور ایجابی تھے۔ اور افراد و جماعات کی زندگیوں پر اس کے اثرات بہت عظیم تھے۔

مشارقہ اور فن تعلیم:۔ ابن خلدون نے تمام فنون میں جن میں سرفہرست فن تعلیم ہے مشارقہ کی حذاقت و مہارت کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ وہ اس بارے میں ساری دنیا سے زیادہ ذہین اور طباع ہیں۔ حتیٰ کہ اہل مغرب کے دماغوں میں یہ بات راسخ ہو گئی ہے کہ مشارقہ فطرۃً بنی نوع انسان میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ ابن خلدون کے نزدیک یہ رائے ان علماء کی ہے جنہوں نے مشرق کا سفر کیا، وہاں کے لوگوں سے رابطہ بڑھایا اور ان سے علوم و فنون سیکھے۔ اس کے بعد جب وہ وطن لوٹے تو انہیں اہل مشرق کی فطری برتری کا یقین ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

"اہل مشرق فن تعلیم بلکہ تمام فنون و صنائع میں زیادہ ماہر ہیں۔ یہاں تک کہ حصول علم کے لئے مغرب سے مشرق کی طرف سفر کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ اہل مشرق کی فہم و فراست اہل مغرب کی فہم و فراست سے زیادہ ہے۔ اور وہ خود اپنی فطرت اولیٰ کی رو سے فطانت و ذکاوت میں ان سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ ان کے نفوس ناطقہ اہل مغرب کے نفوس ناطقہ سے فطرۃً زیادہ عمدہ ہیں۔ اور وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہمارا اور ان کا فرق حقیقتِ انسانیت کی رو سے ہے"

اگرچہ ابن خلدون کی یہ رائے مشارقہ کے حق میں ایک فیصلہ کن شہادت ہے لیکن آگے چل کر اس نے پھر مغاربہ کی فطرت کا دفاع کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مشارقہ اور مغاربہ کا باہمی تفاوت اس حد تک نہیں ہے۔ اور جنہوں نے مندرجہ بالا بات کہی ہے ان کا بیان مبالغہ سے خالی نہیں۔ ابن خلدون کے نزدیک اس تفاوت کی اصل وجہ مشرق میں حضارت و تمدن کا عروج اور مغرب میں بداوت کا غلبہ ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ اس کی طرف سے ابنائے وطن کا ایک معقول دفاع ہے۔ کیونکہ ابن خلدون خود مغربی ہے۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے وہ بربری نسل سے تعلق رکھتا ہے۔

الغرض ابن خلدون نے یہ نتیجہ تمام عالم اسلامی میں تعلیم و تربیت کے مختلف اوضاع کے مطالعہ اور مشارقہ و مغاربہ کے مابین اقوال مشائخ کے حفظ کے لئے ذہنی قوتوں اور ذہنی صلاحیتوں کا باہمی موازنہ کرنے کے بعد نکالا ہے۔ جسے آج سات سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس عہد بعید میں مذکورہ عادات و خصائل اور طبعی خواص آج بھی نہیں بدلے۔ بالکل اسی طرح جیسے ماحول اور زمان و مکان کے اثرات آج بھی اسی طرح کارفرما ہیں۔ چنانچہ ایک عراقی پیدا ہوتے ہی اپنی گفتگو میں میانہ روی اختیار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے بارے میں ہکلاہٹ یا گونگے پن کا وہم ہونے لگتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی فطری گہرائی سے انکار ممکن نہیں۔ نیز آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے مصری بھائی اور بعض مغاربہ حفظ اور یادداشت میں دوسروں سے بڑھے ہوئے ہیں اور قوتِ ذاکرہ اور روانی گفتار میں اب بھی اسی طرح ہیں جس طرح ماضی میں ان کے آباؤ اجداد تھے۔